اسلامی تحریکاتِ اصلاح

محمد سرور

ہنگری کا مشہور مستشرق، جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا، الحاج ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس لکھتا ہے: "اگر مسلمان علماء کے شاندار علمی کارنامے نہ ہوتے، تو یورپ ابھی تک جہالت اور نکبت میں پڑا سڑتا۔ کئی طویل صدیوں تک دنیا کی روحانی روشنی اسلامی ممالک ہی سے پھوٹتی رہی۔ اس کے بعد دنیا دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ چنانچہ جہاں یورپ مادی اور معنوی دنیا کی تسخیر کے لئے نکل پڑا، وہاں مشرق قدیم مذہبی کتابوں کی خشک تاویلات اور ان کی نقلیں کرنے میں لگا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو اس حد تک ماضی اور اس کی قدیم روایات کے حوالے کر دیا کہ وہ گویا اس کے اندر محدود ہو کر فرسودگی کی نذر ہو گیا۔"

گزشتہ صدیوں میں مشرق کے مقابلے میں یورپ کی اس مادی و معنوی سربلندی میں اگرچہ ان تاریخی اسباب کا بھی بڑا دخل ہے، جو اہل یورپ کے حق میں پیدا ہو گئے تھے، اور جن کی بدولت انھیں تمام دنیا پر چھا جانے کا موقع مل گیا، مثلاً امریکہ کا انکشاف، مشرق اور مغرب کی تجارت کا مشرق قریب کے خشکی کے راستے کے بجائے سمندری راستوں سے ہونا اور مشین کی ایجاد۔ لیکن مصنف مذکور کے نزدیک اس کے ساتھ ساتھ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقی ذہنیت بھی ان کے جمود اور معاشی افلاس کا بہت حد تک سبب ہے۔ سولھویں صدی کے بعد سے مشرقی ذہنیت اپنی روائتی قسم کی تربیت کے زیر اثر جامد بن کر رہ گئی۔ اس جمود کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک دفعہ مصر کے مشہور اہل قلم محمد حسین ہیکل نے لکھا تھا: "جب خلافت اسلامیہ کا نظام شورٰی سے وراثت میں مسلمانوں کی نمائندگی کے بجائے ان پر امیر بننے میں، اور ان کے نام سے بات کرنے کے بجائے ان پر استبداد کرنے میں بدل گیا، اور اسے ایسا حق سمجھ لیا گیا، جو خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ہے، تو وہ دن تھا جب مسلمان فقہا نے افراد کی زندگی کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل کے لئے قواعد و ضوابط مقرر کئے اور اس نظام کی مخالفت کے لئے سزائیں تجویز کیں، اور ان سب کو دین سے منسوب کیا۔ جب انھیں یہ ڈر پیدا ہوا کہ مبادا احساسِ ذات اور شعورِ

انسانیت لوگوں کے دلوں میں کہیں ان پابندیوں کے خلاف کوئی حرکت نہ پیدا کر دے، انھوں نے اجتہاد کا دروازہ ہی سرے سے بند کر دیا اور اپنے مقرر کردہ احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو کافر قرار دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو پر یہ فکری جمود اور دینی استبداد مسلّط ہو گیا۔ اور ان کے اکثر علماء ایسی فرضی بحثوں میں الجھ گئے، جن کا عملی زندگی سے دُور کا بھی تعلق نہ تھا[۱]۔"

ہیکل صاحب اپنے اس مضمون میں، جس کا عنوان "الاجتہاد والتقلید" ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں کہ علماء کی ان بحثوں کا سارا زور الفاظ پر ہوتا۔ اور وہ روح سے بالکل خالی ہوتیں۔ اس نے ان میں سے اکثر کو الفاظ کا پرستش کرنے والا بنا دیا۔ اور وہ دین پر ایمان لانے والے نہ رہے۔ وہ مادی صورتوں کے پرستار ہو گئے اور اللہ کے پرستار نہ رہے، جو مادہ، زمان اور مکان سے منزّہ اور ماوریٰ ہے" اور یہ نتیجہ تھا تقلید کا، جس نے ذہنوں کو بنجر بنا دیا، اور وہ اس قابل نہ رہے کہ ان بلندیوں تک پہنچ سکیں، جن کا دین اسلام متقاضی تھا۔ موصوف کے نزدیک اندھی تقلید خواہ وہ اپنے پہلوؤں کی ہو، یا یورپ کے نئے لوگوں کی، دونوں ایک سی ہیں اور دونوں سے ایک ہی سے نتیجے نکلتے ہیں، یعنی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور انسان میں آزادیٔ فکر نہیں رہتی اور آگے کے بجائے ہمیشہ پیچھے کو دیکھتا ہے۔

مسلمانوں کے فکری جمود اور اندھی تقلید کے اس رجحان نے، جس کا آغاز ان کے ہاں سیاسی استبداد سے ہوا تھا، آخر میں مسلمانوں کو اس درجے پر پہنچا دیا کہ جب اٹھارھویں صدی میں یورپی اقوام نئے افکار و خیالات سے سرشار ہو کر مشرق کی طرف بڑھیں تو پوری اسلامی دنیا ان کے قدموں میں تھی۔ اور اس کی معاشی لوٹ کھسوٹ میں کوئی بھی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔ عین اسی زمانے میں یورپ کے اس سیاسی استیلا و تسلط اور معاشی استحصال کے خلاف دنیائے اسلام میں ردّعمل ہوتا ہے، اور وہاں مختلف ناموں سے اصلاحی تحریکیں جنم لیتی ہیں۔ اس ردّعمل کی روداد ہنگری کے مستشرق جرمانوس کی زبان سے سنیئے۔

لیکن اسلامی دنیا میں یورپ کی یہی دخل اندازی تھی، جس نے آخر کار چیدہ اور منتخب مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے عوام اور مذہب کی خاطر اٹھیں۔ چنانچہ جہاں جہاں یورپی تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں کو یورپی افکار سے سابقہ پڑا، وہاں ان کی بیداری نے سب سے زیادہ شورش انگیز صورت

---

[۱] ہفت روزہ "السیاست" ۷ جنوری ۱۹۳۳ء

اختیار کی ۔۔۔۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ مذہب ہی کے اختلاف نے مسلمان اقوام کو اتنا پیچھے ڈال دیا ہے، وہ اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ کرنے لگے۔ وہ گزرے ہوئے دنوں کی عظمت کا ذکر کرتے۔ اور اس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے۔"

عہد حاضر میں احیائے اسلام کی یہ تحریکیں تقریباً ایک ہی زمانے میں مختلف ملکوں میں اٹھیں۔ اگرچہ اپنی ظاہری شکل میں یہ ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف تھیں لیکن ان سب کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ صحیح اور حقیقی اسلام کا احیاء ہو تاکہ اس طرح مسلمانوں کو پھر وہ عظمت و سربلندی حاصل ہو جو تاریخ اسلام کے اوّلیں دَور میں انہیں حاصل تھی۔

احیائے اسلام کی یہ تحریکیں اگرچہ جرمانوس صاحب کے الفاظ میں یورپ کی دخل اندازی کا نتیجہ تھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی سوتیں بہت پہلے سے عالمِ اسلام میں پھوٹ چکی تھیں اور ان سے بہت سے ملکوں کے اہل علم کسی نہ کسی حد تک مستفید ہو چکے تھے۔ آخری صدیوں میں اندھی تقلید اور جمود کے خلاف سب سے پہلی آواز امام ابن تیمیہؒ کی تھی۔ وہ ۶۶۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۲۸ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔" امام ابن تیمیہؒ کے زمانے میں تقلید شخصی رائج ہو گئی تھی۔ ہر بات کا جواب اپنے مذہب اور مسلک کی کتابوں سے دیا جاتا تھا۔ فقہی امور میں تو یہ تقلید جامد ہو گئی تھی ۔۔۔۔ امام موصوف نے سب سے پہلے یہ طریقہ بدلا۔ مختلف علوم و فنون کا کوئی جزئی سے جزئی مسئلہ کیوں نہ ہو، سب سے پہلے وہ قرآن مجید میں اس کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے ۔۔۔۔۔ اس کے بعد بہ ترتیب حدیث اور فقہ کے حوالے دیتے تھے۔ ان کے اس نئے طرز تحریر نے علماء کے اندر قرآن مجید اور حدیث نبوی میں تدبر و تفکر کرنے کا ایک خاص ذوق پیدا کر دیا۔ ان کی تصنیفات سے نہ صرف ان کے زمانے کے علماء کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہوئی بلکہ ان کے بعد سے ہر ایک دَور کے علماء کے خیالات اور ان کی تحریروں پر ان کا اثر پڑنے لگا۔ امام ابن تیمیہؒ نے خود بھی قرآن و حدیث کا خوب چرچا کیا اور عام لوگوں کو بھی اس کی طرف توجہ دلائی، جس سے عام مسلمانوں میں شریعت اسلامیہ پر عمل پیرا ہونے کا ایک خاص احساس پیدا ہو گیا"[۱]

امام ابن تیمیہؒ کی دعوت ان کے قابل شاگردوں اور ان کی کتابوں کے ذریعہ دُور دُور تک پہنچی اور اس نے دنیائے اسلام میں جمود اور اندھی تقلید کے خلاف ایک لہر پیدا کر دی۔ جس سے بہت سے اہل

---

[۱] امام ابن تیمیہؒ از افضل العلماء محمد یوسف کوکنی عمری ایم اے۔ مدراس یونیورسٹی۔

علم متاثر ہوئے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی بارھویں صدی کے وسط میں جب مدینہ منورہ پہنچے، تو وہاں بقول مولانا ابوالکلام آزاد۔ ابن تیمیہؒ اور ابن القیمؒ دونوں کی کتابیں حضرت شیخ ابراہیم کورانی (متوفی ۱۱۰۱ھ والد شیخ ابو طاہر کردی استاد حدیث شاہ صاحب) کی وسعت نظر و بلندی مشرب کی وجہ سے ان کے مطالعے میں رہ چکی تھیں۔ اس مطالعہ کی جھلک شاہ صاحب کی کتابوں میں کافی نظر آتی ہے..

اس ضمن میں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ بے شک شاہ صاحب امام ابن تیمیہؒ کی دعوت کتاب وسنت سے متاثر ہوئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے تصوف و معرفت میں ابن عربی اور مجدد الف ثانی سے بھی اثر لیا اور خاص طور سے اکبری دور میں سرزمین ہندوستان میں عقلیت اور حکمت عملی کو جو فروغ حاصل ہوا تھا انھوں نے اسے بھی ایک حد تک اپنایا۔ اور ان تینوں رجحانات کو سمونے کی کوشش کی۔ مصر، شام اور جزیرہ عرب کے مختلف حصوں میں امام ابن تیمیہ کے اثرات براہ راست پڑے، اور مستنشرشدین کا دائرہ وقت کے ساتھ ساتھ برابر وسیع ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ پروفیسر محمد ابوزہرہ کے الفاظ میں نجد میں امام محمد بن عبدالوہاب کی دعوت تجدید و اصلاح کے نتیجے میں بارھویں صدی ہجری میں محمد بن سعود نے ابن تیمیہؒ کے مسلک کی تبلیغ و اشاعت اور تائید و حمایت کے لئے تلوار میان سے نکالی.... یہ چھوٹی سی مملکت "سعودیہ" افکار ابن تیمیہ پر عمل پیرا ہو گئی [1]

چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں سید جمال الدین افغانی کے شاگرد رشید شیخ محمد عبدہ نے مصر میں اپنی اصلاحی تحریک شروع کی، جس کے اثرات ان کے شاگردوں کی بدولت دنیائے اسلام کے دور دراز حصوں تک پہنچے۔ وہ جمود اور اندھی تقلید کے خلاف تھے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "اسلام نے علی الاعلان بیان کیا کہ انسان اس لئے پیدا نہیں ہوا کہ کوئی اس کی گردن میں رسی ڈال کر کھینچتا پھرے۔ بلکہ اس کی فطرت یہ ہے کہ علم سے کائنات کی نشانیوں سے اور واقعات و حوادث کے آثار سے ہدایت حاصل کرے اور حقیقی معلّم وہی ہے جو لوگوں میں تحقیق کے ذوق کو پیدا کر کے انہیں رشد و ہدایت کے راستے پر چلائیں۔ مشہور مستشرق گولڈزیہر نے شیخ محمد عبدہ کی تحریک اصلاح کے تین عوامل بتائے ہیں۔ امام غزالی کے اخلاقی و مذہبی تصورات۔ دوم تیرھویں صدی عیسوی کے دو موحدین ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد ابن القیمؒ الجوزی

---

[1] حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ از محمد ابوزہرہ (اردو ترجمہ)

کے حد سے زیادہ سلفی رجحانات اور سوم زمانہ حاضر کی ترقی کے مطالبات سے مطابقت پیدا کرنے کی ضرورت [1]

اسی زمانے میں برّصغیر پاک وہند میں سرسیّد، دیوبند اور بعد میں مولانا شبلی اور ان کے ندوۃ العلماء کی اصلاحی، تعلیمی اور دینی تحریکیں اٹھیں۔ ترکی میں تنظیمات کے نام سے اصلاحی اقدامات ہوئے اور انڈونیشیا میں شیخ محمد عبدہ کے شاگرد شیخ رشید رضا کے رسالے "المنار" کا اثر پھیلا گو یہ سب تحریکیں جمود اور اندھی تقلید کی مخالفت کرتی تھیں اور مسلمانوں کو نئے دَور کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی دعوت دیتی تھیں لیکن ان سب کا زور اسی پر تھا کہ مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بنیں اور اسلام میں اس کے طویل عہد زوال میں اِدھر اُدھر کی جو رطب و یابس چیزیں شامل ہو گئی ہیں، ان کا انکار کر کے وہ اصل اسلام کی طرف لوٹیں۔ قدرتی طور پر اس مذہب میں، جو یہ مانتا ہے کہ اس کے پاس ہدایت کا آخری اور مکمل سرچشمہ خدا کی کتاب کی شکل میں موجود ہے، اصلاح و تجدید کے معنی یہی ہوں گے کہ اس سرچشمۂ ہدایت کی طرف لوٹا جائے، اور اس سے استفادہ کیا جائے۔ ان تمام اصلاحی تحریکوں میں جو کم و بیش بیسویں صدی کے ربع اوّل تک دُنیائے اسلام میں مقبول رہیں، یہی رجحان غالب تھا۔ وہ سب کی سب عہد نبوت اور خلافت راشدہ کو ایک مثالی دَور سمجھتی تھی، اور ان کے پیش نظر اصلاح سے مراد اسی دَور کا احیاء تھا۔ مولانا ظفر علی خان مرحوم عوامی جلسوں میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اکثر اس رجحان کا اظہار اپنے اس تاریخی فقرے میں یوں کیا کرتے تھے "بس ایسی اُلٹی زقند لگاؤ کہ جہاں تم تیرہ سو سال پہلے تھے، وہاں پہنچ جاؤ۔"

یہ مختصر سا خاکہ ہے ان اصلاحی تحریکوں کا جو موجودہ تحریکوں سے، جو اِس وقت عالمِ اسلام میں چل رہی ہیں، پہلے کی ہیں۔ اب مختصراً موجودہ یعنی جدید اصلاحی تحریکوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک لبنانی اہل قلم حسن ساب لکھتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اسلام کو دَورِ حاضر کے جس چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، وہ مغرب یعنی اکثر و بیشتر مغربی یورپ، مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے روس اور امریکہ کی طرف سے تھا اور آج اسلام کو جس چیلنج سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے وہ کئی اطراف سے ہے۔ یعنی مغرب سے، کمیونسٹ مشرق سے اور کافی حد تک ہندوستان اور افریقہ کی قومیتوں اور ان کی ترقی پسندی (پروگریسیوازم) سے۔ موصوف کے الفاظ میں :۔" بے شک اسلام ان تمام چیلنجوں پر غالب آیا، جن سے اسے اپنے ابتدائی ادوار میں سابقہ

---

[1] اسلام اور تحریک تجدد مصر میں۔

پڑا لیکن آج وہ جس چیلنج سے رُد در رُد ہے، وہ ان تمام سے مختلف ہے، جن سے وہ اس سے پہلے عہدہ برآ ہو چکا ہے۔ جہاں تک مغربی استعمار سے سیاسی آزادی حاصل کرنے کا تعلق ہے، اسلام اس میں یقیناً کامیاب رہا ہے اور الجزائر کی جدوجہد آزادی اس کی روشن ترین مثال ہے لیکن سیاسی آزادی کے حصول کے بعد عہدِ حاضر کے چیلنج سے نبرد آزما ہونے کی جدوجہد آزاد اسلامی ملکوں میں شروع ہو رہی ہے۔ رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے موجودہ مسلمانوں کے اس مرحلے کو جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹنے کا ضرور نام دیا ہوتا۔ یعنی اب تک ان کی جدوجہد دوسروں کے خلاف تھی، اور اب انہیں خود اپنے آپ سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔

عہد حاضر کی شکل میں اسلام کو آج جس چیلنج سے سابقہ پڑ رہا ہے، وہ مختصراً مشتمل ہے ایک مختلف نوعیت کے علم کی بے اندازہ طاقت، ایک مختلف نوعیت کی تنظیم اور ایک مختلف طرز زندگی پر۔ اس چیلنج کے ردّعمل کے طور پر مسلمانوں میں جو اصلاحی رجحانات پیدا ہوئے، وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے زمانے میں ہمارے ہاں جو کچھ تھا، وہ عہد حاضر نے جو کچھ ہمیں دیا ہے، اس سے بہتر ہے۔ اس لئے ہمیں اس مثالی دَور کی تجدید کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ ساتھ عہد حاضر میں ٹیکنالوجی میں جو ایجادات ہوئی ہیں، انھیں اپنا لینا چاہیئے۔ یہ مسلک آج سعودی عرب کی ریاست، سنوسیوں، جماعت اسلامی، اخوان المسلمین، حزب التحریر اور دار السلام کا ہے۔

۲۔ ہمارے ہاں جو کچھ تھا، اس میں بعض اچھائیاں ہیں اور عہد حاضر نے جو کچھ دیا ہے، اس میں بھی اچھائیاں ہیں، ہمارا طریقۂ اصلاح یہ ہونا چاہیئے کہ اپنے ہاں کی باقیات صالحات کی تجدید کریں اور اس میں عہد حاضر کی اچھائیاں بھی شامل کرلیں۔ یہ مسلک جمال الدّین افغانی، شیخ محمد عبدہٗ، رضا، علی عبدالرازق، ابن بادیس اور ان کے متبعین کا ہے، جن میں علمائے دین بھی ہیں، مفکّر بھی ہیں اور سیاسی لیڈر بھی۔ عرب دنیا، پاکستان، ایران اور انڈونیشیا کی زیادہ تر قومی جماعتیں کسی نہ کسی حد تک اسی مسلک سے رہنمائی حاصل کرتی ہیں۔

۳۔ جو کچھ ہمارے پاس، خواہ وہ اچھا تھا یا بُرا، اس کا دَور بیت گیا اور عہد حاضر نے جو کچھ دیا ہے، وہ اس پر سبقت لے گیا ہے۔ اس لیئے اسے ہمیں آج کلیتہً اپنا لینا چاہیئے۔ باقی رہا مذہب کا سوال، تو یہ ایک شخص کا نجی معاملہ ہے، اور اس میں اسے آزادی ہونی چاہیئے۔ اس مسلک کا سب سے نمایاں علم بردار ترک شاعر ضیا گوکلپ تھا۔ جس کے افکار نے کمال ازم کی شکل اختیار کی۔ اگرچہ مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین بھی اسی راہ پر چلے، لیکن وہ ایک مقام پر جا کر رُک گئے اور اب ان کا نقطۂ نظر کچھ درمیان درمیان ہے۔

اس کے علاوہ دنیائے اسلام میں ایک اور رجحان بھی اُبھر رہا ہے اور وہ مارکسزم کا ہے۔ اس کے پیش نظر

اسلام اور قرآن سے قطع نظر کر کے مکمل طور پر تبدیلی لانا ہے۔ اس رجحان کے سوا اس وقت مسلمان ملکوں میں بھی جو اصلاحی تحریکیں چل رہی ہیں، ان میں سے کسی میں بھی قرآن مجید سے انکار نہیں کیا جا رہا۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ بعض مصلحین اس کے من مانے معنی کرتے ہیں۔ اس کی تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں، اور جتنی اہمیت اسے دینی چاہیئے نہیں دیتے، لیکن قرآن کا انکار کوئی بھی نہیں کرتا۔

اوپر جن تین مسلکوں کا ذکر ہوا ہے، ان میں سے پہلے مسلک پر آج پورے عالم اسلام میں صرف سعودی حکومت ہی عمل پیرا ہے۔ اس کے محکمہ" امر بالمعروف" کے سربراہ محمد بشمل نے قومیت اور اسلام کے موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے، جس میں ایک جگہ وہ اپنی حکومت کے طرز عمل کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:۔ "اسلام دنیا کا بہترین اصول اور موزوں ترین طریقہ حیات ہے ..... اس ملک میں صرف ایک ہی اصول اور ایک ہی دعوت پیش کی جا سکتی ہے، اور وہ اسلام کا اصول اور دعوت ہے۔ یہ واحد مملکت ہے جو اس زمانے میں خدا تعالیٰ کی توحید، قرآن کے احکام، رسول اکرمؐ کی سنت اور سلف صالح کے نظریات پر قائم ہوئی ہے۔" اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایسی مملکت میں کوئی نئی چیز اس وقت تک اختیار نہیں کی جا سکتی، جب تک کہ پہلے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ قرآن کے خلاف نہیں۔ یعنی ان کے نقطۂ نظر سے۔

دوسرے مسلک والے جس کے علمبردار سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ مصر میں اور سرسیّد اور ان کے ہم خیال برّصغیر میں تھے، اسلام کو دینِ عقل قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک جو چیز عقل کے معیار پر پوری اُترتی ہے، وہ اسلام کے خلاف نہیں۔ ان کے ہاں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے اور آج سیاسی و انتظامی و معاشی نظم و نسق حکومت کے لیے جو تبدیلیاں ناگزیر ہیں وہ ان کے حق میں تھے۔ چنانچہ شیخ محمد عبدہ نے بنک کے منافع کو جائز قرار دیا تھا۔

اس مسلک پر چلتے ہوئے آج ایک مسلمان مملکت اپنے ضابطۂ قوانین میں فقہی قانون کے ساتھ ساتھ سیکولر قانون کو شامل کر سکتی ہے۔ وہ ایک جدید طرز کا آئین اختیار کر سکتی ہے اور اس کے ساتھ یہ صراحت بھی کر دیتی ہے کہ اس کا سربراہ اور صدر مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ آج اکثر عرب ملکوں، پاکستان اور ایران کا اس پر عمل ہے اور اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی ایسا قانون نہ بنے جو قرآن کی روح کے خلاف ہو۔ اس مسلک کے حامیوں میں سے لبنان کے ایک پروفیسر المحمصانی ہیں، جنہوں نے اپنی کتاب "فلسفہ اصول فقہ اسلامی" میں لکھا ہے: "مسلمانوں میں ایسے خلفاء رہنما اور فقیہہ گزرے ہیں جنہوں نے قرآن کی نئی تعبیر کرنے

کی اجازت دی ہے۔ ان کے نزدیک اس نئی تعبیر کے لئے ضروری ہے کہ پہلی تعبیر جن حالات واسباب کی بنا پر ہوئی، وہ بدل چکے ہوں۔ اسی طرح مصلحت عامہ اور ضرورت عامہ کے ماتحت بھی قرآن کے مفہوم کی نئی تعبیر ہو سکتی ہے۔ چنانچہ موصوف کے اس نقطہ نظر کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان خود قانون ساز کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں اور اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن مجید کے ظاہری الفاظ کے پابند رہیں، صرف اس کی روح کی پابندی ہونی چاہیئے۔ اسی مسلک کے تتبع میں مصر نے شرعی عدالتوں کو جو اب تک وہاں چلی آرہی تھیں، جدید سول عدالتوں میں مدغم کر دیا ہے اور پورے ضابطۂ قوانین پر نظر ثانی ہو رہی ہے۔ اور تیونس میں ایک نئے قانون کے ذریعہ تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دیا گیا ہے

اب رہا تیسرے مسلک کا معاملہ، جس پر کمالی ترک گامزن ہیں، وہ زیادہ سیدھا سادا اور جرأت مندانہ ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے اجتہاد کا حق جو اسلام کی رو سے مسلمانوں کو حاصل ہے، صحیح حق داروں یعنی عوام کے نمائندوں کو دے دیا ہے۔ اور اب ان پر مشتمل قومی اسمبلی قانون بنانے کی مجاز ہے۔ بعض غیر ترک اہل الرائے نے بھی جن میں علامہ اقبال مرحوم شامل ہیں، اجتہاد کے بارے میں کمالی ترکوں کے اس نقطۂ نظر کی تائید کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اجماع کے یہ معنی لئے ہیں کہ جب ترک قوم کا اپنے ہاں سیکولر نظام حکومت قائم کرنے پر اجماع ہو جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے قرآن کو ترک کر دیا ہے۔ الغرض آزاد مسلم مملکتوں کو جیسے جیسے اپنے مسلمان عوام کے لئے قانون سازی کرنی پڑ رہی ہے، ان کے ہاں دوسرا اور تیسرا مسلک جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، قریب آتے جا رہے ہیں اور ترکی جیسا سیکولر ملک بھی نئے قوانین اور نئی تبدیلیوں کے جواز کے لئے قرآن وسنت کی نئی تعبیرات سے استمداد کرتا ہے۔

لبنانی مضمون نگار کے الفاظ میں اگر پہلے مسلک کے حامی قدامت پسندوں اور سلفین کا گروہ عقل و استدلال اور تاریخی تغیر و تبدل کے درمیان صحیح ربط پیدا کرنا سیکھ لے جس کی تلقین خود قرآن مجید نے کی ہے، تو یہ تینوں مسلک :- ایک قدامت پسندوں کا، دوسرا اعتدال پسندوں کا، اور تیسرا انتہا پسندوں کا۔ ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں اور سب مل کر قرآن کے بتائے ہوئے صحیح راستہ پر چل سکتے ہیں۔

دنیائے اسلام میں آج جتنی بھی اصلاحی کوششیں بروئے کار ہیں، سوائے مارکسزم کے متبعین کے سب اپنے استدلال میں قرآن ہی کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ ان میں بعض کے استدلال کو خواہ آپ کھلی تحریف کا نام دیں اور ان کے خلاف علمائے کرام کی غالب اکثریت کفر کا فتوٰی ہی کیوں نہ دے، اب تک کسی مسلمان ملک میں

قرآن کے انکار کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اور سیکولر سے سیکولر مسلمان بھی تجدید و اصلاح کے حق میں قرآن ہی سے مدد لیتا ہے البتہ وہ اس کے مفہوم کی نئی تعبیر کرتا ہے۔ یہ رجحان بہت حد تک اسلام اور مسلمانوں کے لئے خوش آئند ہے۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کا قومی ضمیر مسلمان رہتے ہوئے دورِ حاضر کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اور اس کے نزدیک آج کی معاشی اجتماعی اور سیاسی ضرورتیں اسلامی رُوح کو برقرار رکھتے ہوئے پوری کی جا سکتی ہیں۔ اور جدید بننے کے لئے ضروری نہیں کہ قدیم کا سرے سے انکار ہو۔ بلکہ قدیم اور جدید میں ہم آہنگی پیدا کر کے امت مسلمہ آگے بڑھ سکتی ہے۔

جہاں تک عقائد کا تعلق ہے، اسلام نے توحید، رسالت، انسانیت اور اخلاق عامہ کے بارے میں جو تصوّرات دیئے ہیں، جب بھی ان کا مقابلہ دوسرے مذاہب کے ان تصوّرات سے ہوا ہے، اسلام ہمیشہ غالب رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں بہت کم لوگ اسلام ترک کر کے ان مذاہب میں سے کسی مذہب کو اختیار کرتے ہیں۔ مسلمانوں پر ایک بڑی ابتلا یورپی اقوام کی سیاسی غلامی تھی۔ خدا نے کیا اس سے انھیں نجات مل گئی ہے۔ اب ان کے سامنے اپنی معاشی و سماجی پس ماندگی کو دُور کرنے کا مسئلہ ہے۔ اور یہ اتنا نظریاتی نہیں، جتنا عملی ہے اس میں خیال آرائی نہیں۔ اقدام چاہیئے۔ اس صورت حالات نے کہ ایک طرف ان پر مشرق کی طرف سے کمیونسٹ ملکوں کی یلغار ہو رہی ہے اور دوسری طرف امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں نے ان پر ہلّہ بول دیا ہے، اس مسئلے کو اور بھی نازک، پیچیدہ، اہم اور خطرناک بنا دیا ہے۔ یہ اسلام کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے اور یہ چیلنج محض عقائد، نظریات اور ریلزم کی قسم کا سطحی نہیں، بلکہ یہ افراد اور قوموں کی مجموعی زندگی کو محیط ہے اور اس کا جواب مثبت عمل، نتیجہ خیز عمل اور مجموعی عمل سے ہی دیا جا سکتا ہے۔

لبنانی مضمون نگار کے الفاظ میں:۔ "سماج روحانیت سے بے تعلق ہو جائے، تو اس کا کچھ بھی حشر ہو سکتا ہے اور اگر روحانیت کی جڑیں سماج میں نہ ہوں، تو وہ بجا طور سے مارکس کی افیون ہو سکتی ہے۔ ہم نے بار بار اس امر کا اعادہ کیا ہے کہ اسلام ان دونوں کا جامع ہے اور دونوں کو باہم ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ اسلام کی منفرد اور امتیازی خصوصیت ہے، جو اس سے کسی حال میں چھٹنی نہیں چاہیئے۔ اس ضمن میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ سماج اور روحانیت کا باہمی تعلق حرکی اور نمو پذیر ہے نہ کہ جامد۔ دنیا کی مادی زبان میں روحانیت کا سرچشمہ انسان بحیثیت فرد کے ہے اور سماج کا سرچشمہ انسان بحیثیت جماعت کے۔"

اور آخر میں بقول مضمون نگار موصوف کے:۔

"آج انسانیت کے روحانی مستقبل کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس ضمن میں اسلام کدھر جائے گا اور کیا کرے گا۔ اسلام نے اپنی ابتدائی صدیوں میں مغرب کی توحید پرستی اور مشرق کے کائنات ہی کو ذات الٰہ سمجھنے والے عقیدہ وحدت الوجود میں ایک تخلیقی رشتہ پیدا کیا تھا۔ آج ان دونوں اور مادی وحدانیت (MONISM) کے درمیان ایک تخلیقی رشتہ بننے کے لئے اسلام کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی ان صدیوں کی حرکی اور تغیر قبول کرنے والی روح کو آزادی، انصاف اور نظم و ضبط کے تخلیقی دائرے میں کار فرما کرے۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے اپنی ابتدائی صدیوں میں سامی عقیدۂ توحید۔ جس میں ذات الٰہی کی تنزیہہ پر زیادہ زور تھا، اور آریائی عقیدہ وحدت الوجود کے درمیان، جس میں کائنات ہی کو ذات الٰہ ماننے کا رجحان غالب ہے، جو ایک تخلیقی رشتہ پیدا کر کے اس عہد میں ایک مرکزی انسانی فکر بہم کیا، اور جیسے آج مادی وحدانیت یعنی مارکسزم کو اپنے اس مرکزی انسانی فکر سے ہم آہنگ کر کے ان دونوں میں پہلے کی طرح ایک تخلیقی رشتہ پیدا کرنا ہے، غرض اسلام کا یہ مشن مسلمانوں کے کس طبقے کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہو سکتا ہے۔ آج ہمارے ہاں سب سے اہم سوال یہی ہے۔

جہاں تک سکہ بند علماء کی اکثریت کا تعلق ہے، ہمارے نزدیک یہ حضرات اس راہ میں روک تو ہو سکتے ہیں، لیکن ممد و معاون نہیں۔ کیونکہ ایک تو بحیثیت مجموعی وہ اس فکری خلا کو جو گزشتہ آٹھ سو سال کے جمود نے ان کے ذہنوں میں پیدا کر دیا ہے، پُر کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ دوسرے ان کے جماعتی مفادات زیادہ تر ہر تبدیلی کے مخالفوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ چنانچہ ان کی طرف سے اس قسم کے ہر اقدام کی مخالفت ہو گی اور اگر کسی ملک میں ان علماء کو برابر غلبہ حاصل رہا، تو اس کا بہت امکان ہے کہ عہد حاضر کی شدید اور فوری ضرورتیں اس ملک کو دوسری انتہا پر لے جائیں۔ اور قدامت پرستی کا ردّ عمل بے عنان آزاد روی ہو، جو ظاہر ہے، اچھا نہیں ہو گا۔